ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

آزادی کی نفسیات

عام فہم ہونے کے باوجود آزادی بھی ایسا ہی مبہم اور غیر متعین سا تصور ہے جیسے محبت یا لذت یا زندگی۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ میں ان الفاظ کے معنی سمجھتا ہوں لیکن جب وضاحت چاہو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص اس سے کوئی مختلف چیز مراد لیتا ہے۔ کوئی شخص عشق سے جذبات کا ہیجان مراد لیتا ہے کوئی کہتا ہے کہ یہ اجزائے حواس کے شیرازے کا پریشان ہونا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ ایک بیماری ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بیماری نہیں بلکہ تمام ملکوں کی دوا ہے۔ یہی افلاطون ہے اور یہی جالینوس ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ عشق بیکاروں کا ایک مشغلہ ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ عشق کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ فطرت نے بقائے نسل کے لیے ایک فریب بلکہ ایک جادو بنا رکھا ہے۔ کہیں عشق اور ہوس کے ڈانڈے آپس میں مل جاتے ہیں۔ کہیں عشق مجازی ہے کہیں حقیقی۔ کہیں عشق اشیاء و اشخاص ہے اور کہیں عشق ایک نصب العینی اور کلی حقیقت ہے۔ ایسے ہی لذت کا حال ہے۔ ہر انسان بلکہ ہر جاندار کی فطرت لذت کی طالب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن لذت کی حقیقت کیا ہے اور کہاں ملتی ہے۔ اس تصور کو واضح کرنا چاہو تو سادہ سی بات بہت الجھ جاتی ہے۔ کسی کے ہاں فقط حیوانی لذتیں ہی لذت ہیں۔ کسی کو عقلی اور روحانی زندگی میں لذت معلوم ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ خواہشات نفس کا پورا کرنا لذت آفریں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ حقیقی لذت، لذت کا خیال چھوڑ دینے اور ضبط نفس سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی کو جد و جہد میں لذت ملتی ہے اور کسی کو سکون میں۔ غرضیکہ یقین کی کوشش میں لذت کا بظاہر سادہ سا مفہوم مبہم اور حیرت زا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی حال آزادی کا ہے۔ بچہ بڑوں کی حکومت سے اور شاگرد استاد کے حکم سے آزادی چاہتا ہے۔ غلام مالک سے چھٹکارا چاہتا ہے اور محکوم حاکم سے۔ کوئی آزادئ دیدار چاہتا ہے۔ کوئی آزادئ رفتار، اور آزادئ گفتار۔ زاہد شیطان

مرحوم خلیفہ صاحب کی یہ تقریر ۱۹۴۶ء کے اوائل میں دکن ریڈیو حیدرآباد سے نشر کی گئی تھی۔

کی گرفت سے آزاد ہونا چاہتا ہے، اور کافر خدا کے پنجہ سے۔ نادار افلاس سے آزاد ہونا چاہتا ہے اور زردار حکومت کے ٹیکس سے اور چوروں کی دستبرد سے۔ مال والا بھی آزادی کا متمنی ہے اور چور بھی۔ بہت سی عورتیں مردوں کی اور رسم و رواج کی عائد کردہ قیود سے آزادی چاہتی ہیں اور بہت سے مرد عورتوں سے نیچے رہنے اور مجبور رہنے میں اپنی خیریت سمجھتے ہیں۔ اب ایسے مفہوم کی نسبت قطعی طور پر کیا فیصلہ کیا جائے جو ہزار قسم کی صورتوں میں ہزار مختلف معنی اختیار کر لیتا ہے لیکن عقل کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق کچھ وضاحت پیدا کی جائے۔ آسمان پر سیارے، فضا میں پرندے، اور سمندر میں مچھلیاں آزاد معلوم ہوتی ہیں اور بعض اوقات انسانوں کو اپنے سے اس کمتر مخلوق پر رشک بھی آتا ہے اور کبھی کبھی کوئی شاعر کہہ اٹھتا ہے کہ کاش میں طائر ہوا ہوتا لیکن ذرا علم اور بصیرت سے دیکھو کہ کہیں بھی آزادی نہیں ہے۔ مذہب والا کہتا ہے کہ تمام مخلوق تقدیروں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ سائنسدان اور ریاضی دان کہتا ہے کہ نہ کوئی سیارہ آزاد ہے اور نہ کوئی ذرہ آزاد نہ زمین و آسمان آزاد ہیں اور نہ زمین و آسمان والے آزاد۔

بقول غالب:

گر چرخ فلک گردی سر برخط فرماں نہ ور گوئے زمیں باشی وقف خم چوگاں شو

کچھ اسی قسم کے مفہوم کا یہ شعر ہے:

کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد بریدۂ ز ہمہ باخدا گرفتار است

ایک طرف دیکھو تو فطرت ہر طرف پابند ہے۔ دوسری طرف ہر ذرہ اور ہر جان آزادی کی طالب اور اس کے لیے کوشاں ہے۔ اب طبیعات والے کہہ رہے ہیں کہ مادے کے انتہائی ذرات آزادہ رو اور بیتاب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کیا پر اسرار معمہ ہے کہ اس آزادی اور بیتابی کے باوجود ان کے اعمال کے قوانین اور حدود بھی ہیں جن سے وہ تجاوز کرتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ کوئی پرندہ قفس میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ شیر پنجرے میں افسردہ بھی ہوتا ہے اور مضطرب بھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت ہر جگہ اپنے خمیر میں آزادی کا جوہر رکھتی ہے۔ لیکن ہر جگہ اس کو پابندی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بقول اقبال

وہ چیز نام ہے دنیا میں جس کا آزادی سنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے

کہتے ہیں کہ انسان کو خدا نے آزاد پیدا کیا۔ لیکن وہ ہر جگہ پابہ زنجیر ہو گیا ہے۔ یہ بھی آسانی سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ خدا کو مخلوق کے لیے آزادی پسند ہے یا پابندی۔ آدم و حوا نے جنت میں آزادی برتی تو

وہاں سے نکال باہر کیے گئے۔

معلم الملکوت نے آزادی برتی تو اسے ابلیس بنا کر ملعون کر دیا گیا۔ آزادی کی سزا میں لعنت کا طوق جو اس کے گلے میں ڈالا گیا تو وہ یوم محشر یا شاید اس کے بعد تک بھی چکی کا پاٹ بن کر اس کی سرکش گردن میں آویزاں رہے گا۔

نہ مذہب اس کا فیصلہ کر سکا اور نہ انسان کی منطقی عقل کہ انسان اپنی فطرت میں مختار ہے یا مجبور، آزاد ہے یا پابند۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ہم مختار ہیں اور کبھی معلوم ہوتا ہے کہ مجبور ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ہر انسان اپنی تقدیر کا معمار ہے اور کبھی یہ کہ وہ کچھ نہیں چاہ سکتا جب تک کہ خدا نہ چاہے۔ پھر اس کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ بھی موجود ہے کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔

بقول میر تقی:

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی　　چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

گلشن راز کا مصنف محمود شبستری کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا اور کہتا ہے کہ جس کا مذہب جبر نہیں وہ گبر ہے اور اس کے لیے وہ حدیث کا سہارا لیتا ہے:

ہر آنکس کہ مذہب غیر جبر است　　نبی فرمود کو مانند گبر است

غرض کہ یہ بات بھی صاف نہ ہوئی کہ آزادی کا وجود ہے بھی یا نہیں یا جس اختیار کے ذریعہ سے ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں، وہ حقیقت میں کہیں ہے بھی یا نہیں یا محض نفس کا ایک دھوکا ہے۔ مرزا غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ حکومت انگریزی نے مہاراجہ الور کو حکمران ریاست تسلیم کر لیا ہے اور اس کو اختیارات عطا کر دیے ہیں لیکن یہ اختیار ایسا ہی ہوگا جو خدا نے بندوں کو دے رکھا ہے۔ گویا مجازی طور پر آزادی ہوگی اور حقیقی طور پر پابندی۔ خیر ان مسئلوں کا فیصلہ نہ تو کبھی ہوا اور نہ کبھی ہوگا:

"کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را"۔ چلو اس پر پیچ و خم راہ سے نکل کر ہی رستہ اختیار کر لیں کہ زندگی دونوں چیزوں کا مرکب ہے۔ اس میں جبر بھی ہے اور اختیار بھی۔ پابندی بھی اور آزادی بھی۔ اپنا ایمان جبر اور اختیار کے بین بین ہی رکھیں تو شاید خیر الامور کے مرکز کے قریب ٹھہریں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ انسان مجبور ہے یا مختار۔ وہ شخص ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کو فرمایا کہ اپنا ایک پاؤں زمین پر سے اٹھاؤ۔ اس نے فوراً اٹھا دیا۔ پھر فرمایا کہ اس پاؤں کو زمین پر

رکھے بغیر دوسرا پاؤں بھی اٹھاؤ۔ اس نے کہا کہ جناب یہ نہیں ہو سکتا۔ فرمایا کہ بس ایک پاؤں اٹھانے کی حد تک تم آزاد تھے۔ لیکن دونوں پاؤں بیک وقت اٹھانے کی حد تک تم پابند ہو۔ یوں ہی سمجھ لو کہ زندگی آزادی اور پابندی کا مرکب ہے اور اصل ایمان یہی ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کی حقیقت کا انکار نہ کیا جائے۔ باقی رہا معین طور پر یہ ہی سمجھ سکنا ایک دشوار امر ہے کہ کتنی پابندی ہے اور کتنی آزادی۔ کہاں میرے اختیار سے کچھ ہو رہا ہے اور کہاں کس قسم کا نامعلوم جبر میری گردن میں کمند ڈال کر مجھے کھینچ رہا ہے:

رشتۂ درگردنم افگندہ دوست — می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

دنیا میں بعض افراد اور بعض اقوام آزادی کے لیے کوشاں ہیں اور بعض پرانے رسوم وقیود کی لادی ہیں اور بعض نئے قوانین کے انبار لگا رہی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ زندگی کا اور انسانی فطرت کا تقاضا کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ اگر زندگی کا مقصد تکمیل اور ارتقا ہے تو ہمارے ہاتھ میں ایک ایسی کسوٹی آجاتی ہے جس سے ہم آزادی اور پابندی دونوں کو پرکھ سکتے ہیں۔ اصل اصول یہ ہے کہ انسان کو بحیثیت فرد اور قوم کو بحیثیت قوم اپنے اپنے اندازِ نگاہ پر عمل کر کے اپنی زندگی کی تکمیل کی اجازت ہونی چاہیے۔ بشرطیکہ یہ آزادی اسی قسم کی دوسروں کی آزادی میں مخل اور دخل انداز نہ ہو۔ قانون اور آزادی دونوں کی فی نفسہٖ کچھ ذاتی قیمت نہیں۔ نہ کوئی قانون بحیثیت قانون اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی پرستش کی جائے۔ اور نہ محض آزادی، آزادی کی خاطر کچھ معنی رکھتی ہے۔ قانون اور آزادی دونوں کا صحیح استعمال بھی ہو سکتا ہے اور غلط استعمال بھی۔ کہتے ہیں کہ عشق بے قانون ہوتا ہے اور قانون بے عشق۔ لیکن اچھی زندگی عشق اور قانون کی ایک معجون مرکب ہے۔ عشق سے میری مراد زندگی کا وہ تخلیقی جذبہ ہے جو زندگی کے اعلیٰ ترین اقدار کو پیدا کرتا اور ان کے حصول کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔ آزادی زندگی کے لیے نہایت ضروری لیکن نہایت خطرناک چیز ہے۔ شاعروں نے عشق کو اکثر ایک قسم کی آگ سے تشبیہہ دی ہے۔ لیکن آگ سے زندگی کی تعمیر بھی ہوتی ہے اور تخریب بھی۔ حرارتِ معین زندگی ہے اور حرارتِ بیجا موت۔ یہی حال آزادی کا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہی حال علم کا ہے۔ محض علم بھی فی نفسہٖ اپنی ذات کے اندر کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ علم کے صحیح استعمال سے انسان فرشتوں سے بلند ہو سکتا ہے۔ اور اس کے غلط استعمال سے ابلیس پر بازی لے جا سکتا ہے۔ بقول مولانا روم:

علم را بر تن زنی مارے شود — علم را بر جاں زنی یارے شود

اسی طرح احمق کے ہاتھ میں آزادی، مجنون کے ہاتھ میں تلوار کی مانند ہے۔ جو خود اس مجنون کو

اور دوسرے بے گناہوں کو مجروح کر سکتی ہے۔ آزادی کے غلط استعمال سے دوسروں کی آزادی بھی سوخت ہو جاتی ہے اور خود نام نہاد آزاد کی آزادی بھی۔ زندگی میں آزادیٔ مطلق کا نہ وجود ہے اور نہ اس کے کچھ معنی ہیں جب تک آدم زاد کے دم میں دم ہے۔ ہاں آدم زاد میں سے دم نکل جائے تو آزاد ہو سکتا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہوا کہ مطلق آزادی اور موت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ کسی ذلیل انسان کو آزادی دے کر دیکھو وہ اپنا اور دوسروں کا کیا برا حال کرتا ہے۔ یہی حال اقوام کا ہے۔ جس قوم کا کوئی بلند نصب العین نہیں اور وہ عقلی و اخلاقی تربیت سے معرا ہے اس کو آزادی دے کر دیکھو کہ وہ اس جوہر کی کیا مٹی پلید کرتی ہے۔ اکثر لوگ آزادی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔ اور اس کی نسبت وہی خیال درست ہے جو شاعر نے عشق کی نسبت کہا ہے کہ:

عشق حقیقی است مجازی مگیر
این دمِ شیر است ببازی مگیر

گیدڑوں کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ شیر کو خفتہ پا کر اس کی دم کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیں دنیا میں جہاں کہیں آزادی ہے اس کے ساتھ کچھ حدود وابستہ ہیں۔ دیکھیے کہ دریا آزاد معلوم ہوتا ہے اور ساحل پابند۔ لیکن اگر ساحل نہ ہو تو دریا کا وجود بھی نہ ہو۔ اس کا پانی پھیل کر ہر جگہ زمین کو دلدل بنا دے۔ وہی پانی جب حدود کے اندر بہتا ہے تو اپنی آزادی میں موجیں مارتا ہوا خشک لبوں کو تر اور خشک زمینوں کو سیراب کرتا ہوا اضافۂ حیات کا باعث ہوتا ہے۔

ارتقائے حیات کے راستے پر چلتے ہوئے آزادی اور قانون دونوں ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے۔ دریا کا وجود ساحل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور موج دریا سے الگ ہو کر موجود نہیں ہو سکتی:

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

زندگی جب اپنی تکمیل کے لیے کوئی نظام پیدا کرے تو اس نظام کی پابندی میں افزونیٔ حیات ہے لیکن جب وہ آگے بڑھتی ہوئی قدیم قیود کو توڑ کر نظامِ نو پیدا کرنا چاہے تو اس وقت آزادی اور انقلاب کی ضرورت پیش آتی ہے۔ آزادی ترقی کی روح ہے۔ ترقی خواہ مادی ہو یا عقلی یا روحانی حیات پابہ زنجیر اس کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن آزادی کے بارے میں مشکل یہ ہے کہ لوگوں میں آزادی کا تصور بھی زندگی کی صورت کے ساتھ ساتھ بدلتا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں

جو حب وطن میں آزادی کے متمنی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ آزادی سے تم کو کیا ملے گا۔ تو جواب واضح طور پر یا مبہم طور پر یہی ہوگا کہ روپیہ زیادہ ملے گا۔ اور کام کم کرنا پڑے گا یا یہ کہ امیروں کی دولت غریبوں میں تقسیم ہو جائے گی تو سب کو آسائش کی زندگی میسر آجائے گی۔ اسی طرح بعض قومیں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی چاہتی ہیں تاکہ دوسروں کی آزادی سلب کر سکیں اور دوسروں پر حکومت قائم کر سکیں۔ آزادی کی حقیقی محبت کا تقاضا ہے کہ انسان سب کے لیے آزادی چاہے اور ہمہ گیر آزادی کو معرض وجود میں لانے کے لیے جن پابندیوں کی ضرورت ہو ان کو خوشی سے اپنے اوپر عائد کرے۔ جائز پابندی آزادی ہی کا ایک دوسرا رخ ہے۔ اور اس سے کوئی متضاد اور الگ چیز نہیں۔ ہر وہ آزادی لعنت ہے جو زندگی کے ارتقا میں مخل ہو۔ اسی طرح ہر وہ پابندی لعنت ہے جو ترقی کی گاڑی میں روڑے اٹکائے۔ آزادی اور ذمہ داری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حقیقت میں آزاد انسان ہی ذمہ دار انسان ہوتا ہے۔ جس طرح غلام کی آزادی محدود ہے اسی قدر اس کی ذمہ داری بھی محدود ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ آزادی ایک عطیہ ہے جو مالک کی طرف سے غلام کو یا حاکم کی طرف سے محکوم کو مل سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزادی ایک قسم کی سیرت اور اہلیت کے ساتھ وابستہ ہے جو فرد یا قوم اپنی سیرت اور اپنی تربیت سے اس کی اہلیت پیدا نہ کرے، اس کو کوئی بطور عطیہ آزادی دے کر آزاد نہیں بنا سکتا۔ اگر طبیعتوں میں غلامی موجود ہے تو وہ ہر آزادی کو کسی نہ کسی قسم کی غلامی میں تبدیل کر لے گی۔ اسی طرح کسی فرد یا قوم نے اگر آزادی کی اہلیت پیدا کر لی ہے تو کوئی خارجی قوت اس کو غلام نہیں بنا سکتی۔ اصل غلامی کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہاتھوں اور پاؤں میں نہیں ہوتیں بلکہ دلوں پر ہوتی ہیں۔ حقیقتاً آزاد شخص کو زنداں میں ڈال دو یا پابہ زنجیر کر دو وہ اس حالت میں بھی آزاد ہے۔ اور غلام کو کھلا چھوڑ دو وہ اس حالت میں بھی غلام ہی ہے۔ قرآن حکیم میں ایک نہایت حکیمانہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا۔ جب تک کہ وہ خود اپنے نفسوں کی حالت میں تغیر پیدا نہ کر لے۔ جس سے معلوم ہوا کہ آزادی یا غلامی کوئی خارجی چیز نہیں ہے جو خود خدا کی جانب سے بھی بے اصول عائد کی جا سکے۔ یہ ایک نفسی کیفیت ہے جس کے لیے نفسی تغیر کی ضرورت ہے۔ آزادی کو صرف حاصل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ قائم رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ کسی آزاد شدہ فرد یا آزاد شدہ قوم کی آزادی برقرار نہیں رہ سکتی جب تک کہ وہ اس کو برقرار رکھنے کے لیے مسلسل جد وجہد نہ کرے۔ خفتگی آزادی کی موت ہے۔ جو کوئی تساہل برتے گا اس کی آزادی

سلب ہو جائے گی یا خطرے میں پڑ جائے گی۔ کوئی نہ کوئی فاعل اور ہوشیار قوت اس کو محروم کر دے گی۔ دائمی خبرداری آزادی کی قیمت ہے۔

جو کوئی یہ قیمت ادا کرنا نہیں چاہتا وہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ آزادی نفسی جہاد کے ذریعہ سے بتدریج حاصل ہوتی ہے۔ یہ چیز بنی بنائی یک دم کہیں سے نہیں ٹپک پڑتی۔ حقیقی آزادی ورزشِ عشق اور مشقِ عدل کا ثمرہ ہے۔

تصنیفات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

تشبیہاتِ رومی

مولانا جلال الدین رومی تشبیہ و تمثیل کے بادشاہ ہیں اور ہر ایک باریک نکتے کی وضاحت کرنے کے لیے ایسی دلنشیں تشبیہ دیتے ہیں جو یقین آفریں بھی ہوتی ہے اور وجد آور بھی۔ رومیات کے مشہور عالم اور نامور مفکر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ان تشبیہات کو بڑے دلکش اور وجد آفریں انداز میں بیان کیا ہے۔ قیمت -/۸ روپے

الٰہیاتِ رومی (انگریزی)

اس بیش بہا تصنیف میں رومی کے افکار و تصورات کی تشریح کی گئی ہے جو الٰہیاتِ اسلامی کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب عالم مادی، عالم روحانی، تخلیق ارتقاء، عشق، مشیت، انسان کامل، فنا و بقا، وجود باری تعالیٰ، وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود جیسے اہم ابواب پر مشتمل ہے۔ قیمت ۳ روپے ۱۲ آنے

حکمتِ رومی

جلال الدین رومی کے افکار و نظریات کی حکیمانہ تشریح جو ماہیتِ نفس انسانی، عشق و عقل، وحی و الہام، وحدتِ وجود، احترامِ آدم صورت و معنی، عالم اسباب اور جبر و قدر جیسے اہم ابواب پر مشتمل ہے۔ قیمت ۳ روپے ۸ آنے۔

ملنے کا پتہ:

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور